ڈاکٹر عرفان شہزاد

حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کی شخصی و فکری مماثلتیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان بہت سی طبعی اور مزاجی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرت عمر کو حضرت موسیٰ سے مشابہ قرار دیا تھا۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کرنے پر حضرت عمر کی طرف سے جب یہ راے پیش کی گئی کہ انھیں قتل کر دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے عمر تمھاری مثال موسیٰ کی طرح ہے۔ موسیٰ نے دعا کی تھی، کہا: اے ہمارے رب، ان کے مال (اب) غارت کرے اور ان کے دلوں کو اس طرح بند کر دے کہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ ۷/ ۳۴۹)

دونوں شخصیات غیرت و حمیت، جرأت و بہادری، عقل و بصیرت، حریت فکر، جرأت اظہار اور قائدانہ کردار کا مجسم استعارہ ہیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے قصے میں حضرت خضر کی کارروائیوں پر فطرت انسانی اور دین و شریعت میں گندھے مزاج کے سبب سے حضرت موسیٰ کی عدم برداشت اور دوسری طرف مختلف مواقع پر دین و شریعت کے معاملات میں حضرت عمر کی غیرت کے مظاہرے ایک جیسے مزاج کا پتا دیتے ہیں۔

حضرت موسیٰ خدا کے حکم کے سامنے اپنی عقل کے استعمال اور خدا کی موجودگی میں اپنے خیالات کے اظہار میں جھجکتے نہیں، اسی طرح حضرت عمر، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ہدایات کے باوجود اپنی عقل سے کام لینے اور اپنی رائے کے اظہار سے چوکتے نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں حضرات کو خدا اور رسول جیسی اتھارٹیز کے سامنے ان کے احکام اور آرا آ جانے کے بعد بھی اپنی عقل کے استعمال اور اپنی رائے کے اظہار پر ان کی طرف سے تائید و پذیرائی ملتی ہے۔

مثلاً، خدا نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور اسے دین کی تبلیغ کرو اور خدا کی طرف سے تنبیہ کرو۔ حضرت موسیٰ نے حکمِ خدا پر سیدھے سیدھے عمل کرنے سے پہلے کچھ معاملات طے کر لینا ضروری سمجھا۔ انھوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ ان کے ہاتھ سے فرعون کی قوم کا ایک شخص غلطی سے قتل ہو گیا تھا، انھیں ڈر ہے کہ فرعون اس جرم میں انھیں قتل کرا دے گا؛ دوسرا، یہ فرمایش کی کہ ان کے بھائی، حضرت ہارون کو بھی نبوت عطا کی جائے، اور وجہ بھی خود بیان کی کہ وہ ان سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، تبلیغ دین میں وہ ان کی معاونت اچھے سے کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول کی اور تسلی بھی دی کہ فرعون ان پر قابو نہ پا سکے گا، بلکہ وہی غالب رہیں گے۔ اس سب کے بعد خدا نے پھر فرمایا کہ اب جاؤ فرعون کی طرف۔

غور کیجیے کہ خدا کا حکم ملنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ کی حریت فکر ان سے کیا کراتی ہے۔ یہ خدا سے ان کی پہلی براہ راست ملاقات تھی اور ایسے میں ان کے ہوش و حواس قائم رہنا ان کے نہایت مضبوط اعصاب اور ناقابل تسخیر حریت و خود اعتمادی کی عکاسی کرتا ہے۔ ادھر خدا بھی ان کی اس جرأت بیان پر ناراض ہونے کے بجاے اسے قبولیت بخش کر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ خدا چاہتا تو حضرت موسیٰ کی طلب سے پہلے ہی تمام لوازمات مہیا کر دیتا، تمام خدشات دور کر دیتا، لیکن خدا بھی گویا چاہتا ہے کہ اس کا بندہ، محض حکم کا غلام ہی نہ بن کر رہ جائے، خدا کی دی ہوئی عقل کا استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔

انبیا علیہم السلام حکم کے بندے تھے، لیکن صاحب عقل و اجتہاد بھی تھے۔ انبیا کو اجتہاد کی بھلا کیا ضرورت ہو سکتی تھی، جب کہ ان کو خدا کی طرف سے براہ راست ہدایت کا ذریعہ میسر تھا، ان کے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ جو مسئلہ بھی انھیں درپیش ہوتا، اس کے لیے انھیں خدا کی طرف سے براہ راست ہدایات مل جایا کرتیں، اپنی عقل کے استعمال کی آزمایش، جس میں خطا کا امکان رہتا ہے، کی نوبت ہی نہ آتی، خصوصاً دین جیسے نازک معاملے میں، دینی اصولوں کے اطلاق میں عقل کے اس خاطی ذریعہ کا استعمال نہ کیا جاتا، لیکن خدا نے انبیا کے معاملے میں بھی ایسا نہیں چاہا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس نے انھیں ہر ہر معاملے میں رہنمائی دینے کے بجاے انھیں اپنی راے بنانے اور اجتہاد کرنے کا موقع بھی دیا۔ اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ ہوتا ہے، یعنی اس میں ان سے خطائیں بھی ہوئیں، جس کی اصلاح پھر خدا نے کی: آدم علیہ السلام نے ممنوعہ پھل کھالیا اور جنت سے نکالے گئے؛ یونس علیہ السلام وقت سے پہلے اپنی بستی چھوڑ کر نکل گئے اور مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیے گئے؛ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر منافقین کی جنگ میں عدم شرکت کے ان کے اعذار قبول کر لیے، جب کہ خدا کی اسکیم یہ تھی کہ اس موقع پر مومن اور منافق علیحدہ ہو جائیں تاکہ ان منافقین کے بارے میں ان کی تباہی کا آخری فیصلہ نافذ کر دیا جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کریم النفسی سے ان کی معذرت قبول کر کے انھیں پیچھے ٹھیرنے کا جواز فراہم کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ. (التوبہ ۹: ۴۳)

''اللہ تم کو معاف کرے، (اے پیغمبر)، تم نے (اِس سفر سے) انھیں رخصت کیوں دے دی؟ (تمھیں چاہیے تھا کہ ایسا نہ کرتے)، یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔''

ادھر حضرت عمر کے معاملے کو دیکھیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صلح حدیبیہ کے موقع پر ان کو قریش کے پاس مذاکرات کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ حضرت عمر کا خاندان سفارت کاری میں مشہور چلا آتا تھا، وہ خود بھی اس فن میں طاق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب درست تھا، لیکن حضرت عمر نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سیدھے سیدھے عمل کرنے کے بجاے ایک تجویز، جسے وہ بہتر سمجھ رہے تھے، آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ آپ نے عرض کیا کہ مکہ میں ان کا خاندان کم زور ہے۔ قبائلی عصبیت کی بنا پر جو تحفظ فرد کو اس سماج میں حاصل ہوا کرتا تھا، اس کے لحاظ سے ان کا کم زور قبیلہ، قریش کے دیگر طاقت ور قبیلوں کے مقابلے میں ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا، بہت ممکن تھا کہ قریش مسلمانوں کے ساتھ موجودہ دشمنی کی وجہ سے ان کی جان کو نقصان پہنچائیں، ایسا اگر ہو جاتا تو ان کی جان بھی جاتی اور سفارت کا مقصد بھی حاصل نہ ہو پاتا، الٹا حضرت عمر کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے جنگ کی نوبت آ جاتی۔ اس صورتِ حال میں حضرت عمر نے اس سفارت کاری کے لیے حضرت عثمان کا نام تجویز کیا، کیونکہ وہ بنوامیہ سے تھے اور قریش، مسلمانوں سے دشمنی کے باوجود مکہ میں بنوامیہ کے طاقت ور قبیلے کے ہوتے ہوئے حضرت عثمان کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قبائلی عصبیت کی بنا پر ایک قبیلے کے لوگ ہر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حال میں دوسرے قبائل کے مقابلے میں اپنے افراد کا تحفظ کیا کرتے تھے، خصوصاً اس صورت میں، جب کہ معاملہ جنگ کا بھی نہیں تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔ قریش کی دشمنی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے حضرت عثمان کو بھی روک لیا تھا، حتیٰ کہ ان کی شہادت کی افواہ اڑی، اسی بنا پر بیعت رضوان ہوئی اور مسلمان ان کا بدلہ لینے کے لیے جنگ کرنے پر تیار ہو گئے، پھر اس کے بعد صلح حدیبیہ ہوئی۔ چنانچہ حضرت عمر کا خدشہ، کہا جا سکتا ہے کہ درست تھا۔ حضرت عثمان کے ساتھ اگر یہ ہوا تھا تو حضرت عمر کے ساتھ اور کیا نہ ہو جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت عمر کے اس عذر اور تجویز کو منظور کر کے ان کی اس حریت فکر کو سند جواز عطا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر قرآن مجید میں فرمایا کہ مصلحت اسی میں تھی کہ اس وقت جنگ نہ ہو۔ اور اللہ نے جنگ ہونے نہیں دی:

وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا. (الفتح ۴۸: ۲۴)

''وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ اُن سے روک دیے، اِس کے بعد کہ اُس نے تم کو اُن پر غلبہ عطا کر دیا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اُسے دیکھ رہا تھا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

غور طلب بات یہ ہے کہ خدا کی یہ مرضی پوری کرنے کے لیے حضرت عمر کی فراست کام میں آئی، کیونکہ اگر وہ اپنی رائے کا اظہار نہ کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو معقول جان کر قبول نہ کر لیتے اور وہ کفار کے ہاتھوں شہید ہو جاتے تو جنگ ہو کر رہتی۔

اب حضرت موسیٰ کا ایک واقعہ دیکھیے، جب بنی اسرائیل نے گائے کے بچھڑے کی پرستش کے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا تو قوم کی اجتماعی توبہ کے لیے بنی اسرائیل کے ۷۰ سرداروں کو لے کر حضرت موسیٰ کوہ طور پہنچے تو خدا نے ایک زلزلہ برپا کیا۔ یہ خدا کے جلال کا ظہور تھا۔ اس موقع پر حضرت موسیٰ نے جو دعا کی، وہ ایک سادہ دعا ہی نہیں ہے، بلکہ پورا آرگیومنٹ ہے۔ نیچے دیے گئے اس دعا کے ترجمے کے خط کشیدہ الفاظ دیکھیے کہ وہ کس طرح خدا سے اس کے اس فعل کے مضمرات اور نتائج بیان کر کے باقاعدہ دلائل کے ساتھ اس سے اس کی رحمت کی درخواست کرتے ہیں:

وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

''اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے تاکہ وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ پھر جب (وہ حاضر ہوئے اور) اُن کو زلزلے نے آ پکڑا

السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ اَنۡتَ وَلِیُّنَا فَاغۡفِرۡلَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَیۡرُ الۡغٰفِرِیۡنَ. (الاعراف ۷:۱۵۵)

تو موسیٰ نے کہا: پروردگار، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ایک ایسے کام پر ہمیں ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے احمقوں نے کیا ہے؟ یہ سب تیری آزمایش ہی تھی۔ تو اِس سے جس کو چاہے (اپنے قانون کے مطابق) گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے، ہدایت بخش دے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔''

حضرت موسیٰ سے بڑھ کر خدا شناسی کا دعویٰ کون کر سکتا ہے جن کو خدا سے براہ راست کلام کا شرف حاصل رہا؟ اب یہی حضرت موسیٰ، خدا سے سیدھی سادی درخواست نہیں کرتے، کہ جو لوگ توبہ کے لیے آئے ہیں، ان پر رحم فرما، بلکہ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہلاک کرنا تھا تو پہلے بھی کر سکتا تھا، اب جب یہ توبہ کے لیے آئے ہیں تو ان کو ان احمقوں کی وجہ سے ہلاک نہ کر جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ یعنی خدا کے اس جلال کے موقع پر بھی حضرت موسیٰ کے حواس برقرار رہتے ہیں اور ادب سے، لیکن دلیل کے ساتھ اپنی درخواست پیش کرتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کا معاملہ دیکھیے۔ وہ اس جلال میں بھی حضرت موسیٰ پر کسی ناراضی کا اظہار کرنے کے بجاے، ان کی درخواست کو یہاں بھی شرف قبولیت بخشتا ہے اور اس کو قرآن میں نقل کر کے حضرت موسیٰ کے طبعی اور فکری استقلال کی پذیرائی کرتا ہے۔

اب حضرت عمر کا معاملہ دیکھیے، منافقین کے سردار، عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھانے پر حضرت عمر نے دامن رسول پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنازہ پڑھانے سے روکنا چاہا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحمت و شفقت کی وجہ سے نماز جنازہ پڑھا دیا، اس پر وحی نازل ہوئی اور آپ کو آیندہ کے لیے منافقین کے لیے نماز جنازہ پڑھانے سے منع فرمایا گیا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِهٖ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ. (التوبہ ۹:۸۴)

''اور (آیندہ) اُن میں سے جو مر جائے، اُس (کے جنازے) پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر (دعا کے لیے) کھڑے ہونا، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کیا ہے اور اِس حال میں مرے ہیں کہ بدعہد تھے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں وحی سے حضرت عمر کی رائے کی تائید حاصل ہوگئی، جس پر حضرت عمر خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔

جب فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت ایمان اور بنی اسرائیل کی غلامی سے رہائی کے مطالبے پر ان سے کہا کہ تم تو وہ ہو جس کو ہم نے پالا تھا اور تم نے تو ہمارا ایک آدمی بھی قتل کر دیا تھا، تم تو ہمارے مجرم بھی ہو۔ نمک حلالی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے تمھاری زبان نہ کھلے، اور تم بجاے احسان مند ہونے، اور اپنے جرم کی وجہ سے بجاے ڈرنے اور شرمندہ ہونے کے ہمیں نیا دین سکھانے آ گئے ہو۔ اس پر حضرت موسیٰ کا جواب حریت فکر کا مینارۂ نور ہے، حضرت موسیٰ اور فرعون کا یہ مثالی مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ. وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِىۡ فَعَلۡتَ وَاَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۸-۱۹)

''اُس نے کہا: کیا ہم نے تمھیں بچپن میں اپنے ہاں رکھ کر پالا نہیں تھا اور (تم وہی نہیں ہو کہ) اپنی عمر کے کئی سال تم نے ہمارے اندر بسر کیے۔ اور پھر اپنی وہ حرکت کی جو کی (اور بھاگ گئے)۔ تم بڑے ہی ناشکرے ہو۔''

احسان مندی اور قصوروار ی، دونوں ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کسی دوسرے کے لیے حق بات کرنا اور اپنے محسن پر تنقید کرنا تو درکنار، انسان کو اپنی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ اس نازک صورت حال میں حضرت موسیٰ کا جواب غور طلب ہے:

قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ. فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ لَمَّا خِفۡتُكُمۡ فَوَهَبَ لِىۡ رَبِّىۡ حُكۡمًا وَّجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ. وَ تِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ. (الشعراء ۲۶: ۲۰-۲۲)

''حضرت موسیٰ نے جواب دیا: میں نے یہ اُس وقت کیا تھا اور (مجھے اعتراف ہے کہ) اُس وقت میں چوک گیا تھا۔ پھر مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا (کہ اِس کی پاداش میں تم مجھے قتل کر دو گے) تو میں تم سے بھاگ گیا۔ پھر میرے پروردگار نے مجھے حکمت و دانش سے نوازا اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے (ایک پیغمبر) بنا دیا۔ اور یہ احسان ہے جو تم مجھے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے!''

آخری آیت پر غور کیجیے۔ حضرت موسیٰ نے واضح کر دیا کہ کسی کی احسان مندی کے باوجود کسی محسن کو اپنے زیر احسان کے استحصال کا لائیسنس نہیں مل جاتا۔ احسان مندی اور نمک حلالی کے نام پر انسانوں کا استحصال ہمیشہ سے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عام بات رہی ہے۔ حق بات کہنے سے لوگ اس وجہ سے رک جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بڑوں کا یا اساتذہ کا یا اپنے اداروں کا نمک کھایا ہوا ہے اور ان پر کوئی درست تنقید کرنا یا ان کے کسی منکر پر نکیر کرنا بھی نمک حرامی کے زمرے میں گنا جاتا ہے۔ اور کسی کا قصوروار ہو جانے کے بعد تو جرم کی سزا کے علاوہ بھی قصوروار کے عام حقوق کا استحصال تو بالکل ہی جائز سمجھا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کا یہ جواب احسان مندوں کو ان کی احسان مندی کے باوجود، اور قصورواروں کو ان کی تقصیرات کے باوجود حریت فکر کے ساتھ حق بات کے لیے کھڑا ہو جانے کا سبق دے رہا ہے۔ خدا کا یہ حکم ایک اور آیت میں اس طرح بیان ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ. (النساء ۴: ۱۳۵)

''ایمان والو، انصاف پر قائم رہو، اللہ کے لیے اُس کی گواہی دیتے ہوئے، اگرچہ یہ گواہی خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔''

ادھر حضرت عمر کا معاملہ دیکھیے، صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنے جوتے بطور نشانی دے کر اور یہ کہہ کر بھیجا کہ جو شخص ملے، اسے خوش خبری سنا دو کہ جس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا، وہ جنت میں جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ جیسے ہی نکلے، پہلی ملاقات حضرت عمر سے ہو گئی۔ حضرت ابو ہریرہ نے جب ان کو یہ خوش خبری سنائی تو حضرت عمر نے بجاے کوئی خوشی منانے کے، ان کے سینے پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ بے چارے گر پڑے اور واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت کی۔ حضرت عمر بھی اتنے میں پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے عرض کیا کہ لوگوں کو اس طرح خوش خبری سنانا مناسب نہیں۔ لوگ اس بشارت کا غلط فائدہ اٹھا لیں گے اور اس غلط فہمی کے بھروسے پر عمل کرنا ترک کر بیٹھیں گے۔ آپ نے فرمایا: اچھا ٹھیک ہے، رہنے دو، لوگوں کو عمل کرنے دو۔ یہاں بھی دیکھیے کہ حضرت عمر کی راے کو بارگاہ نبوت سے تائید حاصل ہوئی۔ فہم دین اور مزاج نبوت کا کتنا درست اندازہ تھا حضرت عمر کو! حضرت عمر کی حریت فکر کا یہ مظاہرہ غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی راے کو قبول کر لینا اہل اختیار کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ و قلم طلب فرمایا کہ میں تمھیں کچھ ایسا لکھ کر دے جاؤں کہ میرے بعد تم گم راہ نہ ہو گے۔ اس موقع پر حضرت عمر نے نہایت جرأت مندانہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رائے دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت، کامل طریقے سے قرآن کی صورت میں پہنچا دی ہے تو مزید کسی چیز کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اچھی نہیں، اس حالت میں آپ کا کچھ لکھوانا شاید مناسب نہ ہو، مبادا کوئی غلطی ہو جائے۔ ہماری ہدایت کے لیے قرآن کافی ہے۔ اس پر صحابہ کے درمیان بحث ہوگئی، کچھ نے حضرت عمر کی مخالفت کی اور کچھ نے ان کی تائید کی۔ آوازیں بلند ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزرا اور آپ نے سب کو باہر چلے جانے کا کہہ دیا۔ اس واقعہ کے بعد بھی رسول اللہ کئی دن حیات رہے، لیکن آپ نے ایسا کچھ نہ لکھوایا جس کا عندیہ آپ نے پہلے دیا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی وقتی کیفیت تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھوانا چاہا، مگر جب آپ کی طبیعت بحال ہوگئی تو آپ نے بھی ایسی کوئی بات بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ ایک رسول کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری تھی کہ آپ ہر وہ بات امت کو پہنچا کر دنیا سے رخصت ہوں جو ان کی رسالت کا تقاضا اور امت کی ہدایت کے لیے ضروری تھی۔ یہ چیز قرآن میں واضح طور پر بتائی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ ۵: ۶۷)

''اے پیغمبر، (اور) جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ (انھیں) پہنچا دو اور (یاد رکھو کہ) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اُس کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اللہ اِن لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔ (تم مطمئن رہو)، اللہ (تمھارے مقابلے میں تمھارے) اِن منکروں کو ہرگز کامیابی کا راستہ نہ دکھائے گا۔''

یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کی ہدایت کے لیے کوئی ضروری بات بتانے سے محض اس وجہ سے رک گئے کہ کچھ صحابہ نے اس وقت لکھوانا مناسب نہ جانا تھا۔ ممکن ہے وہ ایسی ہی کوئی بات ہوتی جس میں قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کی نصیحت ہوتی۔ بہرحال، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد کا طرز عمل بتاتا ہے کہ حضرت عمر کی حریت فکر نے یہاں بھی درست طرزِ عمل اختیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں لکھوائی۔

یہی حریت فکر تھی جس کی وجہ سے حضرت عمر سے دین کے معاملات میں اجتہادات کا سب سے زیادہ ظہور ہوا۔ آپ کے اجتہادات کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ کئی مواقع پر آپ کی رائے کی تائید میں وحی نازل ہوتی رہی۔ مذکورہ بالا امثال کے علاوہ، ایک اور موقع پر جب منافقین کی اہل بیت نبی میں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سکینڈل بنانے کی مہم عروج پر تھی تو اس کے سد باب کے لیے ازواجِ نبی کے لیے پردے کا خصوصی اہتمام حضرت عمر کی خواہش تھی۔ وحی کے ذریعے سے یہ خصوصی احکامات سورۂ احزاب میں نازل ہوئے۔ حضرت عمر کے اجتہادات نے پوری امتِ مسلمہ کا علمی رجحان متعین کیا۔ ان کے اجتہادات پر مستقل تصانیف موجود ہیں۔

حریت فکر کا ایک لازمی اظہار مظلوم کی حمایت ہے۔ ایک آزاد ذہن جو اپنا استحصال برداشت نہیں کرتا، وہ دوسروں کے استحصال پر بھی خاموش نہیں رہ پاتا۔ یہ وہ غیرت ہے جو انسانیت کا حسن ہے۔ اسی غیرت کی بنا پر حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے اس قبطی کا قتل بھی ہو گیا تھا جو ان کی قوم کے ایک فرد سے جھگڑ رہا تھا۔ چونکہ قبطی کا ظالم ہونا ہی زیادہ قرین قیاس تھا، اس لیے اس قضیے میں آپ کو یہی گمان ہوا ہو گا کہ زیادتی قبطی کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبطی بھی جھگڑا چھوڑنے پر تیار نہ ہوا تو آپ نے اسے گھونسا مارا جو ایسا بے ڈھب پڑا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ تاہم، بعد میں آپ کو اندازہ ہو گیا کہ جھگڑالو اسرائیلی تھا، کیونکہ اگلے دن وہ پھر کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود آپ وہ جھگڑا بھی ختم کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ مظلوم کی حمایت کا دوسرا واقعہ تب پیش آیا جب حضرت موسیٰ مدین پہنچے تو انھوں نے دو خواتین کو دیکھا کہ ایک کنویں کے پاس اپنی بکریاں پانی سے روکے کھڑی ہیں، جب کہ کنویں پر دوسرے لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے پاس گئے اور ان کی مجبوری دریافت کی۔ لڑکیوں نے بتایا کہ علاقے کے لوگ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔ یہ جب چلے جائیں گے تو وہ اپنی بکریوں کو پانی پلا پائیں گی، ان کے والد عمر رسیدہ اور ضعیف تھے اور یہ کام انھیں ہی کرنا پڑتا تھا۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ نے آگے بڑھ کر ان کی بکریوں کو پانی پلوا دیا۔

مظلوم کی حمایت کے اسی مزاج کا اثر حضرت عمر کے ہاں متعدد واقعات میں ملتا ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مظلوم کو انصاف کی فراہمی ویسے بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عدل عمر ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا۔ یہ طے تھا کہ چاہے کوئی کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، کسی پر ظلم کرنے کے بعد وہ ان کے انصاف سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے واقعات کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ مثلاً غسان کا بادشاہ جبلۃ الایھم مسلمان ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ حضرت عمر خوش ہوئے کہ ایک طاقت ور شخص اسلام کا حصہ بن گیا اور اس کی طاقت اسلام کی خدمت میں استعمال ہو سکے گی۔ پھر اسے مکہ بھیجا گیا، جہاں خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اُس کے تہ بند کے کنارے پر ایک دیہاتی کا پاؤں آ گیا۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر اُس کے منہ پر تھپڑ دے مارا، جس سے اس کی ناک اور سامنے کے دانت بھی ٹوٹ گئے۔ دیہاتی فریاد لے کر مدینہ میں حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شاہ غسان کو طلب فرمایا، اس نے اعتراف کیا، بلکہ یہ بھی کہا کہ حرم نہ ہوتا تو میں اسے اس حرکت پر قتل کر دیتا۔ حضرت عمر نے فیصلہ دیا کہ بادشاہ اس دیہاتی کو راضی کرے یا قصاص میں منہ پر تھپڑ کھائے۔ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ آپ کے ہاں شاہ و گدا میں کچھ فرق نہیں ہے کیا؟ آپ نے فرمایا: بالکل نہیں، اسلام نے دونوں کا مرتبہ ایک جیسا کر دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے رات کی مہلت مانگی۔ دیہاتی سے پوچھا گیا کہ کیا وہ بادشاہ کو ایک رات کی مہلت دینے پر راضی ہے، اس نے رضامندی دے دی۔ بادشاہ رات کے اندھیرے میں ہی مدینہ منورہ سے بھاگ کر ملک شام کی طرف چلا گیا اور مرتد ہو گیا۔ ایک شخص کا اسلام سے نکل جانا گوارا کر لیا گیا، مگر انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔

عقل کے استعمال اور اپنی رائے رکھنے کے معاملے میں حضرت موسیٰ اور حضرت عمر، دونوں سے غلطی بھی ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے خدا کو دیکھنے کی فرمایش کر ڈالی اور حضرت عمر حدیبیہ کا معاہدہ کرنے پر اعتراض کر بیٹھے۔ دونوں اپنی جرأت پر نادم ہوئے۔ خطا کا امکان، عقل کے استعمال کا لازمہ ہے۔ انسان کو خدا نے اس سے مبرا نہیں کیا۔ اسی خطا کوشی کے ساتھ خدا نے عقل و رائے کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ انسان کی آزمایش ہی یہی ہے۔ وہ پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اپنے عقل و فہم کے مطابق دیانت سے جو سمجھے اس پر عمل کرے، خطا کرے، لیکن درست بات سامنے آنے پر انا اور تسلیم حق کی آزمایش میں حق کو تسلیم کر کے کامیابی کا راستہ اختیار کرے۔ اندھی تقلید نہیں، بلکہ عقل کی راہ سے عمل کرنا ہی خدا کا مطلوب ہے اور اس میں خطا کو گوارا کیا گیا ہے۔

ایک طرف خدا اور رسول ہیں جن کے سامنے حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کی حریت فکر کے یہ مظاہرے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے رویے دیکھیے کہ دینی پیشوا ہوں یا سیاسی رہنما، خاندان کے بزرگ ہوں یا کسی محکمے کے سربراہ، ان کی اندھی تقلید اور غلامانہ فرماں برداری کو مطلوب سمجھا جاتا ہے۔ رہنمائی کے منصب پر بیٹھے افراد بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ان کے پیروکار ان کے ایک اشارے پر بلا سوچے سمجھے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں، بلکہ حقیقتاً ان کی جانیں بے دریغ لٹائی بھی جاتی ہیں۔ اپنے رہنماؤں پر تنقید تو دور کی بات ہے، ان کے سامنے سوال کرنا ہی گستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔ محکمے کے سربراہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کے ماتحت کی کوئی رائے ان کی رائے سے مختلف ہو، خاندان کے بزرگ اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کے غلط کو بھی درست کہنا اصل فرماں برداری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کی تذلیل ہے کہ اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو۔ جس بات کو وہ درست سمجھتا ہو، اس کے اظہار پر پابندی ناروا جبر ہے۔ ایک طرف خدا اور رسول ہیں جو اپنے بندوں اور پیروکاروں کی رائے بھی قبول کرتے ہیں، اور دوسری طرف انسان ہیں جو اپنے جیسے انسانوں کی رائے کو اپنی رائے سے مختلف پا کر اسے بغاوت اور مخالفت سمجھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیتے ہیں۔

دین میں عقل کے استعمال اور جرأت اظہار کی جو نازک راہ حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کے ذریعے سے کھلتی ہے، اس نے ہمارے لیے دین کے احکام میں سوچ سمجھ کر عمل کرنے کا مطلوبہ نمونہ پیش کیا ہے۔ اگر خدا اور رسول کی بارگاہ میں حریت فکر کی پذیرائی کا یہ عالم ہے تو دنیاوی معاملات میں تو اس کو بدرجۂ اولیٰ گنجایش دینا ضروری ہے کہ یہاں ایسی کوئی اتھارٹی نہیں ہو سکتی جس کا علم خدا کے علم کی طرح کامل اور ہدایت رسول کی ہدایت کی طرح قطعی ہو۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''...روزہ اللہ کے لیے ہے اور وہی اُس کی جزا دے گا۔ یعنی بندے نے جب بغیر کسی سبب کے محض اللہ کے حکم کی تعمیل میں بعض جائز چیزیں بھی اپنے لیے ممنوع قرار دے لی ہیں تو اب وہ ناپ تول کر اور کسی حساب سے نہیں، بلکہ خاص اپنے کرم اور اپنی عنایت سے اُس کا اجر دے گا اور اِس طرح بے حساب دے گا کہ وہ نہال ہو جائے گا۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۵۷)